اردو ناول میں سماجی اقدار کا بدلتا منظر نامہ

The changing Scenario of Social Values in Urdu Novel

ڈاکٹر مظہر عباس
اسسٹنٹ پروفیسر اردو
اسلامیہ یونیورسٹی، بہاولپور
ڈاکٹر طارق محمود
ایسوسی ایٹ پروفیسر اردو،
پرنسپل گورنمنٹ کالج، میانچنوں

Abstract:

Man for his personal benefit or comfort, started living with fellow beings. He formatted society and set up certain societal norms to regulate and discipline his life. With the evolution of human society, the debate commenced on these societal norms and values which were either comic or relative in their nature and form. This debate also raised question, who creates these values and for what personal gains. Surely, such a class or community might have preferred their personal interest before forming these societal values. The debate also envisioned that these societal norms and values could safeguard the liberty of human beings and at the same time could assail the rights of the people. Literature, one of the indices of human nomenclature, always advocates high social norms and values. It represents progressive societal deals. It also negates biased thoughts and values existing in the form of color, caste and creed. This article reviews societal norms and morals in the line with 'Urdu novel'.

Key words: Social norms, Relative, Human society, Innovators, Adopters, Late adopter, Metaphysics, social classes, Oppressive Forces

کلیدی الفاظ: سماجی اقدار، اضافی، انسانی سماج، مابعد الطبیعات، سماجی طبقات، مقتدر قوتیں۔

سماجی اقدار بنیادی طور پر وہ ضابطے ہیں جو انسانی سماج میں توازن اور ترتیب قائم رکھنے کی خاطر وضع کیے جاتے ہیں۔ لین دین کے معاملات سے لے کر خوشی غمی، ملنا ملانا، پہننا اوڑھنا غرض ہر معاملے اور کیفیت کے لیے سماج میں اقدار کا نظام موجود ہوتا ہے۔ اقدار اضافی ہوتی ہیں، ضرورت کے تحت جنم لیتی ہیں اور جب ان کی ضرورت نہیں رہتی یہ مرحلہ وار خود بخود ختم ہو جاتی ہیں۔ انسان نے اپنی بقا کی خاطر مل جل کر رہنے کا آغاز کیا اس طرح ابتدائی انسانی سماج کی بنیاد پڑی۔ آبادی میں اضافے کے ساتھ سماج نسبتاً پیچیدہ ہوا، سماجی زندگی کو ترتیب میں لانے کے لیے اقدار کا نظام وضع ہوا۔ جوں جوں انسانی آبادی بڑھتی گئی، نئی آبادیاں وجود میں آئیں، نئی اقدار وضع ہوئیں۔ مثلاً" خاندان، جنس، خوراک کا حصول، خوراک کی تقسیم، لڑائی جھگڑوں کے فیصلے غرض اس نوعیت کے معاملات کو حل کرنے کے لیے اقداری نظام وضع ہوا اور سماج کے ارتقا کے ساتھ ساتھ ارتقا پزیر رہا۔ گزرتے وقت کے ساتھ ان اقدار نے نئی شناخت حاصل کی۔ مثلاً لین دین، افراد کی جان اور ان کی ملکیت کے احترام سے وابستہ اقدار کو قانون کا درجہ حاصل ہو گیا۔ مابعد الطبیعات سے وابسطہ اقدار آہستہ آہستہ مذہب کا روپ اختیار کر گئیں۔ فرد، اس کی پسند ناپسند، لباس، سماجی رویے اور میل ملاپ سے وابستہ اقدار بھی ارتقا کے مراحل میں رہیں۔ ان اقدار سے روگردانی پر ناپسندیدگی، سرزنش سے لے کر سخت ترین سزا کا نظام وضع ہوا۔

ذاتی ملکیت کے تصور نے انسانی سماج کو انقلاب آفریں تبدیلیوں سے آشنا کیا۔ اقداری نظام بھی اس سے متاثر ہوا۔ سماج دو طبقات میں بٹ گیا، ملکیت والے اور وہ جن کے پاس ملکیت نہیں تھی۔ ملکیت والے زیادہ بارسوخ ہوئے، معتبر ٹھہرے اور آہستہ آہستہ سماج کے اختیارات کے بھی مالک بن گئے۔ یوں سماجی اقدار پر بھی ان کا کنٹرول ہو گیا، جن پر سماج کا سارا کا سارا نظام قائم تھا۔ اس بااثر طبقے نے ایسی اقدار کو ختم کیا جو آزادی فکر و اظہار، فرد اور فرد کے حقوق سے جڑی تھیں۔ اور ایسی اقدار کی ترویج کی جو اطاعت، تابع داری، تقلید اور قناعت جیسی فکری روش کی حامل تھیں۔ اس مرحلے پر مذہبی طبقے اور مذہبی اقدار سے بھی کام لیا گیا۔ یوں سماج حاکم اور محکوم، حکمران اور رعایا کی واضع تقسیم میں بٹ گیا۔ اور اس کے ساتھ سماجی اقدار بھی تقسیم کے اس راسخ تصور کو پروان چڑھانے لگیں۔

گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ سماجی نظام اور سماجی اقدار اسی ڈگر پر چلتے رہے، مستحکم ہوتے رہے۔ اس دوران بعض حکمرانوں نے قوانین تحریر کرائے۔ سماجی اقدار کے اثرات ایک مشہور واقعے سے سامنے لائے جاسکتے ہیں۔ "سقراط" کو جب موت کی سزا دی گئی تو مقتدر قوتوں کے ایک نمائندے نے انہیں قید خانے سے

فرار کا مشورہ دیا۔ وہاں سقراط کا جواب بہت معنی خیز بھی ہے اور سماجی اقدار کی قوت و اثرات کو بھی ظاہر کرتا ہے۔ سقراط نے کہا کہ میں نے ساری زندگی قانون کی اطاعت کا درس دیا آج اگر اس قانون سے ایک غلط فیصلہ ہو گیا ہے تو میں اس سے منحرف کیسے ہو جاؤں؟ اس واقعے سے نتیجہ نکلتا ہے کہ سماجی اقدار قانون کی اطاعت پر مائل کرتی ہیں۔ اور قانون حکمرانوں کا دیا ہوا ہوتا ہے، یعنی حکمرانوں کی اطاعت۔

تیرہویں صدی عیسوی میں "میگنا کارٹا" کے عنوان سے ایک دستاویزی معاہدہ کیا گیا، جس میں سماجی اقدار اور اختیارات کی درجہ بندی (classification) کی گئی۔ اب سوال یہ ہے کہ "مگنا کارٹا" مقتدر قوتوں کے درمیان طے ہوا؟ ہیئتِ مقتدرہ اور عوام کے درمیان یا پھر عوام اور عوام کے درمیان طے ہو؟ ان سوالات پر بحث کا موقع نہیں لیکن اس دستاویز کے اثرات بہت دیرپا اور گہرے ثابت ہوئے۔ بیسویں صدی تک انسانی حقوق اور قانون اور آئین سازی میں اس دستاویز سے حوالے دیے جاتے رہے۔ اٹھارہویں صدی میں فرانسیسی مفکرین اور تخلیق کار والٹیئر اور روسو کی سماجی اقدار بلکہ اقدار کے عوامی زاویہ کے حوالے سے خدمات بھی تاریخِ انسانی کے لیے ناقابلِ فراموش ہیں۔ روسو کا "معاہدہ عمرانی" کا مرکزی نکتہ یہ تھا کہ اقداری نظام مقتدر قوتوں کے بجائے عوام کی طرف منتقل کیا جائے تاکہ خدا اور اس کے نمائندوں، بادشاہ اور اس کے نمائندوں کے بجائے عوام سماجی اقدار متعین کرے اور قانون بنائے۔ روشن خیالی، انسان دوستی اور جمہوریت جیسی سماجی اقدار کے فروغ میں ان تخلیق کار مفکروں کی خدمات سے انکار ممکن نہیں۔

سماجی اقدار کا تعلق براہِ راست ذرائع پیداوار کے ارتقاء اور آلاتِ سائنس کے ارتقاء سے جڑا ہوتا ہے۔ ارتقاء کا یہ عمل متوازن یعنی دونوں حوالوں سے ہو تو وہ سماج نہ صرف ترقی کرتا ہے بلکہ اس کا اقداری نظام بھی ارتقا پذیر رہتا ہے۔ وہ اقدار جو سماج کے سیاسی، معاشی اور ثقافتی تحرک کا ساتھ دیتی ہیں قائم رہتی ہیں جو سماجی ضرورتوں کا ساتھ دینے سے قاصر رہتی ہیں وہ ختم ہو جاتی ہیں اور ان کی جگہ نئی اقدار لے لیتی ہیں۔ جن معاشروں میں ارتقا کا یہ عمل عدم توازن کا شکار ہو جائے وہاں سماجی اقدار جمود کا شکار ہو جاتی ہیں۔ مغربی سماج میں ذرائع پیداوار فطری ارتقا کے عمل سے گزر رہی ہے، نتیجتاً ان کے ہاں اقدار بھی ارتقا کے اسی فطری تسلسل کا حصہ ہیں۔ مذہب اور جنس سے لے کر ہر موضوع پر کھلا مکالمہ ہوتا ہے، اس لیے اقدار جمود کا شکار نہیں بلکہ عصری سماجی ضرورتوں کے ساتھ جڑی ہوئی ہیں۔

مشرقی سماج کا جائزہ لیا جائے تو، یہاں ذرائع پیداوار، آلاتِ پیداوار، اور سماجی ارتقاء فطری توازن کھو چکا ہے۔ ہم جن مشرقی اقدار پر فخر کرتے ہیں وہ معاصر سیاسی، سماجی، معاشی اور ثقافتی تقاضوں سے دور ہیں، جمود کا شکار ہیں۔ نتیجتاً ہمارے ہاں فکری بحران، ثقافتی جمود، عدم برداشت بڑھ رہی ہے اور مکالمے کی فضا ختم ہوتی جا رہی ہے۔ اس حوالے سے پروفیسر ممتاز حسین کی رائے قابلِ توجہ ہے:

"ہندوستانی سماج میں (قدیم ہندوستان مراد) صدیوں پرانے جاگیر دارانہ نظام کے انمٹ اثرات کے تحت زندگی کی جن قدروں پر زور دیا جاتا رہا ہے وہ داخلی رہی ہیں نہ کہ خارجی ان کا تعلق انسانیت اور اخلاقیات سے رہا ہے نہ کہ سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی سے۔"[۱]

سماجی اقدار پر مکالمہ کرتے ہوئے سوال جنم لیتا ہے کہ آیا یہ اقدار فرد کی نفسی، جذباتی اور سماجی تشفی کا باعث ہیں یا کہیں فرد، اور اس کی آزادی کو محدود کر رہی ہیں؟ اسی طرح ایک اور سوال بھی اٹھتا ہے کہ سماجی اقدار ایک خاص طبقے کے مفادات کا ذریعہ بن رہی ہیں اور کسی دوسرے طبقے کے استحصال کا سبب تو نہیں بن رہیں؟ ان سوالات پر غور کریں تو واضح تفریق نظر آتی ہے۔ وہ سماج جہاں مقتدر قوتیں عوامی رائے کو ترجیح دیتی ہیں وہاں کا اقداری نظام عوام دوست ہوتا ہے اور وہ سماج جہاں مقتدر قوتیں عوامی رائے کو اہمیت نہیں دیتی ہیں وہاں کا ویلیوز سسٹم عوام کو کنٹرول کرنے کے لیے ترتیب دیا جاتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ مغرب کا اقداری نظام بہت حد تک عوم کی رائے کے ساتھ جڑا ہوا ہے۔ اس لیے سماج کی طرح ارتقا کا حامل ہونے کے ساتھ ساتھ عوام دوست ہے۔ مثلاً ہم جنس پرستی کے قانون کو دیکھیے، اچھا یا بُرا، اس سے قطع نظر عوام کی رائے اس کے حق میں تھی، اس لیے اس سماجی قدر کو قانون کا درجہ حاصل ہو گیا۔ جب کہ مشرقی قوموں میں اقدار کا نظام عوام کے بجائے مقتدر قوتوں کے ہاتھ میں ہے، اس لیے اقداری جمود یہاں کا بڑا مسئلہ ہے۔ جہاں تک اردو ناول کا سوال ہے۔۔۔ اردوناول نے اس اقداری جمود کو شروع سے قبول نہیں کیا۔ اردوناول نے موجود اقدار پر سوال اٹھانے کے ساتھ ساتھ نئی اور مثبت اقدار کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا۔

اردو ناول کی اس اجتہادی روش کے پس منظر میں سرمایہ دارانہ حکمران تہذیب کا اہم کردار ہے۔ انگریزوں نے ہندوستان کے پیداواری نظام میں کیا تبدیلیاں کیں؛ یہ آج کے موضوع میں شامل نہیں، لیکن ان کی ہندوستان میں حکمران کی حیثیت سے آمد نے یہاں کے اقداری نظام پر بہت اثرات مرتب کیے۔ ہندوستان میں تعلیم کے حوالے سے کیا صورتِ حال تھی، سرسید اور جدید تعلیم کی تحریک اور اس کی مخالفت سے آپ سب صاحبانِ علم و دانش بخوبی آگاہ ہیں۔۔۔ اس پر بات نہیں کروں گا، میں یہاں عورتوں کی تعلیم کے حوالے سے بات کرنا چاہوں گا۔ سرسید، اکبر اور اقبال جیسے اجتہادی فکر کا حامل مسلمان رہنماؤں کی عورتوں کی تعلیم کے حوالے سے کیا رائے تھی۔۔۔ یا عورت کا سماج میں کیا مقام تھا۔۔۔ اس سے بھی آپ بخوبی آگاہ ہیں۔ مذہبی طبقہ تو آج بھی جدید تعلیم کے حق میں نہیں اور عورتوں کی تعلیم کے حوالے سے سوات، وانا، وزیرستان، اور افغانستان (طالبان دور) میں جو کچھ ہوا اس کو درست خیال کرتا ہے۔ ایسے میں اردو کے پہلے ناول کے دیباچے میں مولوی نذیر احمد اعتراف کرتے ہیں کہ ہمارے مردوں کی طرح عورتوں کا بھی تعلیم کی طرف رجحان نہ ہونے کے برابر ہے۔ اور صرف مذہبی رجحان اور خیالات سے ان کے ذہن کُند ہو جاتے ہیں۔ اور ان کے مزاج پر افسردگی غلبہ پا

لیتی ہے۔[۲] اسی طرح آگے لکھتے ہیں کہ اکثر لوگ عوروں کی تعلیم کو گناہ سمجھتے ہیں۔ ان کا خیال یہ ہے کہ پڑھ لکھ کر عورت غیر مردوں کے ساتھ روابط استوار کر لیں گی۔ غیر مردوں کے ساتھ خط و کتابت کریں گی۔ نذیر احمد کے خیال میں یہ تصور ہی غلط ہے۔ تعلیم انسان کو بہتر انسان بنانے میں مدد کرتی ہے نہ کہ اسے بگاڑنے کا ذریعہ بنتی ہے۔ یہ شیطانی وسوسے ہیں جو مردوں کے دلوں میں ڈالے جا رہے ہیں۔ تعلیم کے نتیجے میں اگر بگاڑ پیدا ہونا ہو تو مرد بھی بگڑیں گے، یہ تصور صرف عورت کے ساتھ کیوں۔[۳]

یہاں مولوی نذیر احمد عورتوں کی تعلیم کے لیے باقاعدہ مقدمہ لڑتے نظر آ رہے ہیں۔ ایک طرف وہ مروجہ سماجی اقدار کی مخالفت کر رہے ہیں اور دوسری جانب ان کا آئیڈیل کردار اصغری انہی روایتی اقدار کا مثالی نمونہ ہے۔ ہم یہ ضرور کہہ سکتے ہیں کہ "مراۃ العروس" نے عورتوں کی تعلیم کے حوالے سے اس وقت کی مروجہ سماجی اقدار کو چیلنج کیا۔ مولوی نذیر احمد کے کردار دو واضح منطقوں میں بٹے نظر آتے ہیں۔ یعنی ان کے پسندیدہ کردار اور ان کے ناپسندیدہ کردار؛ ان کے ناپسندیدہ کرداروں کا قصور فقط اتنا نظر آتا ہے کہ وہ سماج میں آنے والی تبدیلیوں کے ساتھ جڑتے نظر آتے ہیں۔ وہ فکری اور عملی ہر دو سطح پر بدلتے سماج کا ساتھ دینے کے قائل ہیں۔ اس لیے نذیر احمد کے لیے ناپسندیدہ ٹھہرتے ہیں۔

اردو ناول نے بطورِ صنف مشرق اور مغرب کے تہذیبی سنگم پر جنم لیا۔ وضاحت کر دوں کہ اردو ناول نے ایک ایسے عبوری دور میں جنم لیا جب مشرقی تہذیب اپنے عروج کے بعد سیاسی زوال کا شکار ہو رہی ہے اور مغربی تہذیب اپنے تمام تر امکانات کے ساتھ غالب آ رہی ہے۔ سیاسی طور پر زوال آشنا مشرقی تہذیب اپنے ادبی، تہذیبی اور لسانی سروکار میں عروج پر ہے؛ لیکن ہر عروج آشنا تہذیب کی طرح کسی حد تک ٹھہراؤ، جمود اور یکسانیت کا شکار ہے۔ ایسے میں مغربی تہذیب کا تحرک، سائنسی طرز اور جدید علوم سے نئی نسل کا متاثر ہونا انہونی بات نہیں ہے۔ تبدیلی کے اس عمل نے ہندوستانی سماج کے سینکڑوں سالہ اقداری نظام کو متاثر کیا۔ نوجوان نسل نے تبدیلی کے اس عمل کو خوش آمدید کہا تو روایت پسند اور روایت پرستوں نے آخری حد تک تبدیل ہوتی اقدار کی مخالفت کی۔ اس اختلاف کا اظہار اور اصلاح کرتے ہوئے مولوی نذیر احمد سے سیاسی، سماجی، معاشی، معاشرتی اور فکری اقدار میں آنے والی تبدیلیوں کی عکاسی ہو گئی۔ ان کے ناپسندیدہ کرداروں میں کلیم، ابن الوقت، ظاہر دار بیگ اور مبتلا بہت اہم ہیں۔ ان کرداروں پر غور کریں، یہ عمر کے اس دور سے گزر رہے ہیں جسے جوانی یا نوجوانی کہا جاتا ہے۔ اس عمر کا فطری تقاضا ہوتا ہے کہ کچھ نیا کیا جائے۔ ان کے مقابل نذیر احمد جن کرداروں کو لائے ہیں (جو ان کے پسندیدہ کردار بھی ہیں) ان کے نام بتائے دیتا ہوں؛ نصوح، حجتہ الاسلام، میر متقی۔ ان لوگوں اور اس قبیل کے جتنے کردار نذیر احمد لائے ہیں، اپنی فکر، عمل اور حلیے میں کٹر مذہبی ہیں۔ یہ کسی بھی قسم کی تبدیلی کے شدید مخالف، ادھیڑ عمر یا بوڑھے ہیں۔ اسی لیے انیس ناگی ابن الوقت، کلیم اور مبتلا کو اس عہد کے

پرانے معاشرتی، مذہبی، خانگی اور اقداری ضابطوں کے خلاف ردِ عمل کہتے ہیں۔[۴]نذیر احمد کے کردار دو انتہاؤں پر کھڑے، اس عہد کی تبدیل ہوتی سماجی اقدار کی موثر عکاسی کر جاتے ہیں۔ مثلاً کلیم کا فرد کی آزادی کے حق میں اور والدین کی بے جا مداخلت کے خلاف بولنا، سر منڈوانا، ٹخنوں سے اوپر پائجامہ سے روایتی حلیہ جسے اسلامی حلیہ کہا جاتا پر طنز کرنا۔[۵]ابن الوقت کا مسٹر نوبل کو پناہ دینا، ان کے ساتھ کھانا کھانا،[۶]انگریزی لباس پہننا، اور اس پر روایت پرستوں کا ردعمل ان سب کی عکاسی مولوی نذیر احمد کے ناولوں میں ملتی ہے۔

یہی سلسلہ ہمیں ان کے جانشین علامہ راشد الخیری کے ہاں نظر آتا ہے۔ انہوں نے اس وقت اپنے ناولوں میں عورتوں کے مسائل کو اجاگر کیا جب عورت کے مسائل کو زیر بحث لانا غیر ضروری سمجھا جاتا تھا۔ (ان ناولوں کے فنی معیار کو زیرِ بحث لانا میرے دائرہِ کار میں شامل نہیں) ان کے ناول بھی اس عہد کی سماجی اقدار پر سوالیہ نشان لگا رہے تھے۔ رتن ناتھ سرشار نے فسانہء آزاد میں اس عہد کے لکھنو کی سماجی اقدار پر خوجی کے ذریعے گہرے طنز کیے ہیں۔ سرشار نے اس ناول میں لکھنوی زندگی کی عکاسی نہیں کی بلکہ لکھنوی زندگی اور لکھنوی سماجی اقدار کی تنقیدی عکاسی کی ہے۔ سرشار کے دونوں کردارآزاد اور خوجی دو طبقات کی نمائندگی کرتے نظر آتے ہیں۔ خوجی لکھنو کے روایت پرست طبقے کا کیری کیچر caricature ہے۔ دوسری طرف میاں آزاد اپنے نام کی طرح آزاد منش، رویت شکن، تبدیل ہوتے سماج میں نئی اقدار کا طرفدار، روشن خیال اور علم دوست انسان ہے۔ آزاد کا ضعیف الاعتقادی پر طنز دیکھنا ہو تو فسانہ آزاد ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔[۷]لکھنو کی روایتی طرزِ معاشرت اور اقدار دیکھنی ہوں تو "آغاز" کو پڑھ لیا جائے۔ [۸]لکھنو کے بانکوں کا حلیہ اور شوق دیکھیے؛ مصروفیات دیکھیے اور سر دھنیے، رات کو محفلِ رقص و سرور، بٹیروں کی پالی، بانے کی کنکیاں، بھٹیارنوں کی لڑائی، نو چندی جمعرات پرانی منتیں مرادیں۔۔۔ وغیرہ وغیرہ وغیرہ۔ یہ ہیں ہفتہ بھر کی مصروفیات اور میاں آزاد پروفیسر لاک کا سنسکرت زبان پر لیکچر سننا چاہتے ہیں[۹]اب ان دونوں کرداروں کے حلیے سے لے کر پسند ناپسند کا جائزہ لیا جائے تو سماج کی بدلتی ہوئی قدریں سامنے آ جاتی ہیں۔

اردو ناول کی روایت کا ایک بڑا نام پریم چند کا ذکر کرنا چاہوں گا۔ اگرچہ پریم چند معاشرتی اقدار کی پاسداری کے قائل تھے۔ لیکن انکے ناول بھی مروجہ سماجی اقدار پر سوالیہ نشان ضرور لگاتے ہیں۔ یہاں ان کے معروف اور نمائندہ ناول "گؤدان" کو زیرِ بحث لانا چاہوں گا۔ ویسے تو ناول کا سارا بیانیہ مذہبی، اخلاقی، سماجی اور معاشی اقدار پر سالیہ نشان لگا تا ہے لیکن ہوری کا بیٹا گوبر اور بیوی دھنیا یہ دو ایسے کردار ہیں جو کھلی بغاوت کرتے ہیں۔ جاگیر دارنہ سماج کے تحت بننے والی سماجی اقدار کس طرح غریب عوام کو غلامی پر مجبور کرتی ہیں ناول میں جہاں اس کی عکاسی ملتی ہے وہاں، مذہب، ذات برادری اور مرجادہ، کے نام پر بنی اقدار بغاوت سے روکتی ہیں۔ گوبر کا بیوہ جھنیا کو گھر لانا، ہوری اور دھنیا کا اسے قبول کرنا اس وقت کی سماجی اور خاص طور پر ہندوستانی سماجی

اقدار کے خلاف کھلی بغاوت تھی۔ یہی بغاوت اگر ماتا دین کرے تو اسے کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا کہ اسے دھرم کی پشت پناہی حاصل ہے۔ ایک مختصر اقتباس:

> "اب سوچو، اس بدکاری کا گاؤں میں کیا نتیجہ ہو گا۔ جھنیا کو دیکھ کر دوسری بدھواؤں کا من بڑھے گا کہ نہیں؟ آج بھولا کے گھر میں بات ہوئی، کل ہمارے تمہارے گھر میں ہو گی۔ سماج تو ڈر کے بل پر چلتا ہے۔ آج سماج کا آنکس جاتا رہے تو پھر دیکھو سماج میں کیسے کیسے انرتھ ہونے لگتے ہیں۔"[۱۰]

داتا دین، پٹیشوری، جھیکری سنگھ، پنڈت نوکھے رام، داروغہ، رائے صاحب جیسے کردار دھونس دھاندلی، مذہب، سماجی اقدار کے نام پر عوام کا استحصال کرتے ہیں۔ یہ کیسی اقدار ہیں کہ "گئودان" کے نام پر مرتے ہوئے ہوری کے گھر سے سب کچھ نکلوالیا جاتا ہے۔ بنیادی طور پر یہ ناول ان سماجی اقدار کے خلاف آواز اٹھارہا ہے۔

"لندن کی ایک رات" میں تبدیل ہوتی سماجی اقدار کی عکاسی دیکھی جاسکتی ہے۔ دنیا کا بدلتا ہوا منظر نامہ اور ہندوستان میں آزادی کی تحریک نے کس طرح رنگ، نسل اور مذہب جیسے تعصبات کی جگہ وسیع المشرب سماجی اقدار کو جنم دیا۔ نعیم الدین احمد، راؤ، اعظم، عارف، کریمہ بیگم، شیلا اور احسان لندن کی کُہر زدہ رات میں ایک چھت کے نیچے موجود اپنی اپنی سابقہ اور آنے والی زندگی کے اوہام میں مبتلا ہیں۔ ترقی پسند ناول نگاروں نے زیادہ تر ذات پات کی سماجی اور مذہبی منافرت پر مبنی اقدار کو نشانہ بنایا۔ کرشن چندر کے ناول "شکست" میں بھی یہی نظر آتا ہے۔ ناول کا مرکزی کردار "شیام" پوری دنیا کے انسانوں کو بھائی سمجھتا ہے اور انہیں مل جل کر ہر تعصب سے ماورا ہو کر امن و آشتی کے ساتھ زندگی گزارنے، ایک بہتر انسانی تہذیب اور نظامِ اقدار کا خواب دیکھتا ہے۔[۱۱] نوراں، چھایا، ونتی، موہن کماراور شیام جیسے کردار سماجی اقدار کے بندھنوں کو توڑنے کی ہر ممکن کوشش کرتے ہیں لیکن ناکام ہوتے ہے۔

عصمت چغتائی کے ناول اس عہد کی جنسی اقدار پر گہری چوٹ کرتے نظر آتے ہیں۔ جنس ایک ایسا موضوع ہے جس پر آج بھی، مشرقی اقدار گفتگو کی اجازت نہیں دیتی، اس وقت تو ان ناولوں نے تہلکہ برپا کر دیا۔ یہاں تک کہ ترقی پسند تحریک نے عصمت اور منٹو پر پابندی عاید کر دی۔ سوال یہ ہے کہ عصمت کے ہاں جنسی رویے محض سستی شہرت کے لیے ہیں، جھوٹ ہیں یا ان میں کوئی حقیقت بھی ہے؟ لیکن کیا جنس انسانی سماج کا مسئلہ نہیں؟ یہاں اتنا بتانا مقصود ہے کہ اردو ناول نگاروں نے ہر اس سماجی قدر کے خلاف آواز ضرور اٹھائی جو انسانی سماج کی بہتری کے راستے میں حائل تھی۔

عبد اللہ حسین کے ناولوں میں بھی سماجی اقدار کا بدلتا ہوا منظر نامہ نظر آتا ہے۔ اختصار کے ساتھ ایک سماجی قدر کی تبدیلی کا ذکر کرنا چاہوں گا۔ جاگیر دارانہ سماج میں اپنے سے کم مرتبہ اور مشکوک حسب نسب کے ساتھ رشتہ جوڑنا قطعاً برداشت نہیں کیا جاتا۔ ناول کے مرکزی کردار نعیم اور روشن آغا کی بیٹی عذرا کے رشتے کی بات سے جہاں گھر میں تہلکہ برپا ہوا وہاں صوبے بھر کے تعلقہ داروں نے اس شادی کو رکوانے کی سر توڑ کوشش کی۔ ان کے خیال میں یہ ایک مضحکہ خیز عمل تھا۔ اس مخالفت کی بنیادی وجہ طبقۂ امرا کی انفرادیت کو قائم رکھنا تھا۔[۱۲]

ان دونوں کی شادی کا ہو جانا، روشن آغا اور خاندان کا اسے قبول کر لینا یہ سماج میں آنے والی اقداری تبدیلی کا اظہار ہے یا ناول نگار کی خواہش؟ کرشن چندر کے ناول شکست کا مرکزی کردار تمام تر رومانی بغاوت کے باوجود عملی طور پر سماجی اقدار کے ہاتھوں ہار گیا جب کہ عبد اللہ حسین کے کردار عملی طور پر بہت فعال ہیں۔ ایسے ہی "نادار لوگ" کی کنیز بھی سماجی اقدار کے شکنجے کو توڑ کر باہر نکلنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ نام و نسب کے سماج میں ایک چمارن صرف اپنی کوشش اور قوتِ ارادی کے سہارے نہ صرف بھٹہ مالکان کے شکنجے سے نکلنے میں کامیاب ہوتی ہے بلکہ سرکاری محکمے میں ملازمت کر کے آزاد زندگی گزارتی ہے۔[۱۳]

اردو ناول نے نفرت، تعصب، عدم برداشت اور آمریت کے مقابل محبت، تحمل و برداشت، رواداری اور جمہوری اقدار کی آبیاری کی۔ مستنصر حسین تارڑ کا ناول "راکھ" ریاست اور مذہب، تاریخ اور تہذیب کے تعلق پر سوال اٹھاتا ہے وہاں جمہوری اور انسان دوست اقدار کی بات بھی کرتا ہے۔ مختصر اقتباس:

> "تم بنا شک جو مرضی آئے کر لو پر ملک تبھی قائم رہتے ہیں جب وہ اپنی ہزاروں برس کی کمائی کو قلعی بنا کر دیواروں پر سیاسی نعرے نہیں لکھتے۔"[۱۴]

حجاب امتیاز کا ناول "پاگل خانہ" بڑھتے ہوئے جنگی جنون، عدم برداشت، لاقانونیت اور تعصبات کی عکاسی کر رہا ہے۔ ایک طرف دنیا سمٹ کر عالمی گاؤں بن چکی، دوسری طرف یہ گاؤں تباہی کے دہانے پر ہے۔ سائنسی اور خاص طور پر ایٹمی تجربات کے زمین پر کیا اثرات مرتب ہوئے ہیں ناول میں سامنے آتے ہیں:

> "میں بڑے دکھ سے سوچنے لگی نوح کی نافرمان بدبخت قوم کو طوفان نے آلیا تھا اور آج ایک ناقابلِ فہم دیوانگی نے ہمیں آدبوچا ہے۔ عذاب تو ہر قسم کا عذاب ہی ہوتا ہے۔ کیا یہ ایک آسمانی عذاب ہے جس میں آج ساری دنیا گرفتار ہے۔"[۱۵]

مصطفٰے کریم کا ناول ''راستہ بند ہے" سوچ کے کئی در وا کرتا ہے۔ روحانیت، تصوف، درویشی، پیری فقیری مشرقی اقدار کا خاص مزاج ہے۔ اس ناول نے ان اقدار پر سوالیہ نشان لگا دیے ہیں۔ ناول کا مرکزی کردار واجد ایک روحانی ہستی۔۔۔ اس کی بیوی پر ایک فوجی جنسی حملہ کرتا ہے۔ واجد اس کی خیریت پوچھنے کے

بجائے ایک ہی بات پوچھے جاتا ہے کہ شاداں سچ سچ بتا سپاہی تمہارے ساتھ زیادتی کرنے میں کامیاب تو نہیں ہو گیا؟ اسقاط کی تکلیف میں مبتلا شاداں کا ایک جملہ کہ اپنے رب سے پوچھو واجد کو سکتے میں لے جاتا ہے۔ اس کی خاص دنیا میں سکوت تھا۔۔ کوئی آواز نہیں تھی، جہاں وہ سوال کرتا اور اسے جواب ملتا تھا۔ اب کوئی جواب نہیں تھا، اس لیے کہ سوال براہِ راست اس کی انا، اس کی غیرت اور اس کی خودداری کا تھا۔ وہاں کوئی ہوتا تو جواب دیتا، وہ اس کی اپنی تخلیق کردہ دنیا تھی۔[۱۶]

عالمگیریت کے اس دور میں، صارفی سماج کی حیثیت سے ہمارے ہاں رویوں، روایات اور اقدار کے حوالے سے بہت کچھ تبدیل ہو رہا ہے۔ حسبِ روایت ان تبدیلیوں کے حوالے سے کوئی بھرپور اور مثبت مکالمہ نہیں ہو رہا۔ میڈیا، برانڈ کلچر، انٹرنیٹ، چیٹنگ، جنک فوڈ کے اثرات سے ہماری نوجوان نسل براہِ راست متاثر ہو رہی ہے۔ وہ بزرگوں کی روایات اور اقدار کو فرسودہ سمجھنے لگی ہے۔ وہ گیجٹ کے ذریعے دنیا سے تو جڑ رہے ہیں لیکن اپنے خاندان، رشتوں اور اقدار سے بیگانہ ہوتے جا رہے ہیں۔ پرنٹ میڈیا، الیکٹرانک میڈیا اور سوشل میڈیا حقیقت کے بجائے مسخ شدہ، "تشکیلی حقیقت" (Hyper Reality) سامنے لا رہے ہیں۔ میڈیا پر بٹھائے گئے دانشور اور اینکر پرسنز تشکیلی دانش Hyper Intellectually کا بھونڈا نمونہ ہیں۔ مذہبی طبقہ ان بدلتی اقدار اور اخلاقیات کو مذہب سے دوری کا نتیجہ قرار دے رہا ہے۔ رہ گئی عوام تو وہ ان تبدیلیوں کو قیامت کی نشانیوں میں شمار کرتے ہیں۔ ہمارے مقابلے میں انڈیا میں ان بدلتی اقدار پر بامعنی مکالمہ بھی ہو رہا ہے اور ان کے ناول میں بھی اس اقداری تبدیلی کے حوالے سے پو کے مان کی دنیا بہت اہم ناول شمار کیا جاتا ہے۔ اس ناول میں نوجوان نسل خاص طور پر ٹین ایج، صارفیت اور انٹرنیٹ سے جو اثر قبول کر رہی ہے اسے سامنے لایا گیا ہے۔ فیشن کے نام پر مختصر اور تنگ لباس، جو والدین کے لیے شرم کا باعث ہے۔[۱۷] ہم میڈیا اور انٹرنیٹ کی وجہ سے گلوب سے تو جڑ گئے ہیں مگر اپنے ہی گھر میں اکیلے ہو کر رہ گئے ہیں۔ رات کے وقت اگر کھانے کی میز پر اکٹھے ہو بھی جائیں تو بھی ایک دوسرے کے لیے کوئی وقت نہیں۔[۱۸]

اردو ناول نے اپنی ڈیڑھ سو سالہ زندگی میں، سماجی اقدار میں آنے والی ہر تبدیلی کو پیش کیا ہے۔ یہاں ایک اور تبدیلی کا ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ ہمارے ہاں، مشرقی اقدار میں محبت کے حوالے سے بڑا رومانوی تصور رائج رہا ہے۔ یہ محبت کا وہ مثالی تصور ہے جس میں ایک ہی فرد کے ساتھ یا اس کے تصور میں پوری زندگی گزار دی جاتی ہے۔ محبت میں بھی توحید کے قائل ہونے کا تصور کہیں ایک معبود کے مذہبی تصور کے ساتھ جڑتا نظر آتا ہے۔ ہندو مت میں تو مرد کی چِتا کے ساتھ عورت کو زندہ جلا (ستی) دینا مذہبی قدر شمار ہوتا تھا۔ اور اردو شاعری تو محبت کے اس مثالی تصور سے بھری پڑی ہے۔ غالب جیسا باغی شاعر "سر زیرِ بارِ منتِ درباں کیے ہوئے" محبوب کے در پر پڑے رہنے کی بات کرتا ہے۔ پر محبت کے اس

مثالی تصور اور حقیقت میں کتنا فرق ہے یہ آپ مجھ سے بہتر جانتے ہوں گے۔ ناصر کاظمی جیسے شاعر کو محبوب کے علاوہ بھی کسی وجود کی طلب ہوتی ہے۔ جیسی خواہش کرتا ہے تو یہ عین انسانی طلب لگتی ہے۔ زبانی کلامی تو آج بھی یہی کہا جاتا ہے کہ محبت ایک مرتبہ ہوتی ہے؛ پر کی بار بار جاتی ہے۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ انسان جیسے غیر معمولی اور پیچیدہ مظہر سے ایسی توقع رکھنا عبث ہے۔ بعض اوقات ایک فرد، ایک سے زیادہ لوگوں سے، ایک جیسی شدت کے ساتھ محبت ہو جاتی ہے۔ یہ ہمارے سماج کا وہ سچ ہے جسے کوئی تسلیم کرنے کو تیار نہیں۔ کلاس میں طالب علم یہی سوال پوچھتے ہیں۔ بعض اوقات لطف لینے اور بعض اوقات اس مخمصے سے نکلنے کے لیے، جس سے وہ گزر رہے ہوتے ہیں۔ اردو ناول چونکہ زندگی کے بہت قریب ہے اور فرد کے وجودی تجربات تک رسائی رکھتا ہے؛ اس لیے محبت اور جنس کے حوالے سے تبدیل ہوتی اقدار کو سامنے لا رہا ہے۔ اس حوالے سے مرزا اطہر بیگ کا ناول "غلام باغ" کا حوالہ دینا چاہوں گا۔ اس ناول میں محبت کے حوالے سے تبدیل ہوتی اقدار کی عکاسی ملتی ہے۔ ناول میں چار مرکزی کردار ہیں؛ کبیر مہدی، زہرہ، ڈاکٹر ناصر، ہاف مین۔ زہرہ کبیر کی طرف مائل ہے۔ ناصر زہرہ سے محبت کرتا ہے۔ زہرہ اور کبیر مہدی کا تعلق اس حد تک گہرا ہو جاتا ہے کہ وہ کبیر کے ساتھ، اپنی جڑوں کی تلاش میں انعام گڑھ چلی جاتی ہے۔۔۔ مگر، جب کبیر مر جاتا ہے تو وہ کسی خاص تردد کے بغیر ڈاکٹر ناصر کو قبول کر لیتی ہے۔[۱۹] اس لیے کہ زندگی رکتی نہیں، آگے بڑھتی جاتی ہے اور زہرہ بھی آگے بڑھ جاتی ہے۔ یہاں محبت کا روایتی مثالی تصور نہیں ملتا بلکہ زندہ، حقیقی اور عملی تجربہ نظر آتا ہے۔

غرض اردو ناول نے ہمیشہ تعلیم، تہذیب، محبت، تحمل، بردباری، رواداری جیسی مثبت اقدار کی ترویج کی، رنگ، نسل، ذات پات، عورت اور مرد کے سماجی مقام و مرتبے کے حوالے سے امتیازی اقدار کو ہدف تنقید بنایا اور یہی بڑے ادب کی خصوصیت ہوتی ہے۔

حوالہ جات وحواشی

۱۔ مشرف احمد، مرتب، پریم چند کا تنقیدی مطالعہ(کراچی: نفیس اکیڈمی،۱۹۸۶ء)، ص ۱۹۵۔

۲۔ ڈپٹی نذیر احمد، مرأۃ العروس(لاہور: شیخ اکیڈمی، ۱۹۸۱ء)، ص ۵۔

۳۔ ایضاً، ص ص ۱۲:۱۱۔

۴۔ انیس ناگی، ڈپٹی نذیر احمد کی ناول نگاری(لاہور: فیروز سنز، ۱۹۸۸ء)، ص ۸۔

۵۔ ڈپٹی نذیر احمد، توبۃ النصوح(لاہور: ٹیکنیکل پبلشرز، ۲۰۰۸ء)، ص ۹۷۔

۶۔ ڈپٹی نذیر احمد، ابن الوقت(لاہور: سیونتھ سکائی پبلی کیشنز، ۲۰۱۶ء)، ص ۸۳۔

۷۔ رتن ناتھ سرشار، فسانہ آزاد، ملخص بہ: ڈاکٹر قمر رئیس(اسلام آباد: پورب اکادمی، ۲۰۰۷ء)، ص ۱۹:۲۴۔

۸۔ ایضاً، ص ص ۱۵:۱۱۔

۹۔ ایضاً، ص ۱۲۔

۱۰۔ منشی پریم چند، گئودان(لاہور: عشرت پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۶۴ء)، ص ۲۰۷۔

۱۱۔ کرشن چندر، شکست(دہلی: ساقی بک ڈپو، ۱۹۴۵ء)، ص ص ۴۲:۴۱۔

۱۲۔ عبداللہ حسین، اداس نسلیں(لاہور: قوسین، ۱۹۸۴ء)، ص ۳۶۳۔

۱۳۔ عبداللہ حسین، نادار لوگ(لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۴ء)، ص ۴۷۹۔

۱۴۔ مستنصر حسین تارڑ، راکھ(لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۱ء)، ص ۱۷۹۔

۱۵۔ حجاب امتیاز علی، پاگل خانہ(لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء)، ص ۶۷۔

۱۶۔ مصطفےٰ کریم، راستہ بند ہے(کراچی: شہرزاد، ۲۰۰۹ء)، ص ۲۸۳۔

۱۷۔ مشرف عالم ذوقی، پوکے مان کی دنیا(دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۰۴ء)، ص ۱۸۔

۱۸۔ ایضاً، ص ۲۰۔

۱۹۔ مرزا اطہر بیگ، غلام باغ(لاہور: سانجھ، ۲۰۰۷ء)، ص ۸۷۹۔